شہر کے دوسرے کنارے سے





احمد حسین مجاہد عصرِ حاضر کے قومی شعری منظر نامے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا سفر آتی کی دہائی میں شروع ہوا۔ آج وہ نصف صدی کے سنگِ میل پر کھڑے ہیں۔ ''دھند میں لپٹا جنگل'' اور ''اوک میں آگ'' سے ہوتے ہوئے اب وہ ''شہر کے دوسرے کنارے'' سے آواز دے رہے ہیں۔

شاعری کے اس طویل اور تھکا دینے والے سفر میں صرف تین شعری مجموعے اس بات کے عکاس ہیں کہ ان کے ہاں مقدار سے زیادہ معیار اہم ہے اور یہ معیار ہی نہ صرف ان کے ہاں نظر آتا ہے بلکہ ہر اس قاری پر دیرپا اثرات چھوڑتا چلا جاتا ہے جو اعلیٰ پائے کی شاعری کا متلاشی رہتا ہے۔ ہمارے ملک میں بے تحاشا شاعری ہو رہی ہے۔ ہر سال بے شمار شعری مجموعے منظرِ عام پر آتے ہیں، لیکن کوئی اثر چھوڑے بغیر وقت کے گرد و غبار میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ بعض شعرا کی شعری تخلیقات درجنوں میں ہیں۔

احمد حسین مجاہد کو زیادہ شعری مجموعے منظرِ عام پر لانے کی فکر نہیں۔ اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔ کیوں کہ انھوں نے غزل اور نظم میں جتنا کام کر کے اپنی کتابوں میں محفوظ کر لیا ہے وہ انھیں تا دیر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں پر دسترس رکھتے ہیں انھوں نے ان دونوں میں توازن رکھا ہوا ہے۔ اس ہنگامہ خیز دور میں شاعر کم ہی نظر آتے ہیں۔ اکثر کی نظمیں عموماً سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ لیکن ان کی نظمیں کسی نہ کسی اچھوتے موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

وہ خیال کو عمدہ الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ الفاظ و تراکیب کا احتیاط سے استعمال کرتے ہیں، اور اپنے مافی الضمیر کو نہایت نفاست سے نظم میں اتار دیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم مسافر نوازشیں

ہارون الرشید

اپنے اندر گہرا تاثر رکھتی ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے مصرعوں پر مشتمل اس نظم پر رائگانی کے سالوں کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی ہے۔ اس میں ایک کہانی ہے، ایک ایسی کہانی جو ہر آدمی کا مقدر ہے۔ اس کا ادراک دکھ اور درد کی ایک لمبی لکیر کھینچتا ہوا بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

لہلہاتے کھیت سے
خوشوں کے خوشے چنتے چنتے
شام گہری ہو گئی ہے
دور افق پر خامشی کے
بادل کی رنگت سنہری ہو گئی ہے

....

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے اوراق الٹتے ہوئے ایک نظم ''میں'' آگے آتی ہے، یہ دنیا کے طاقت وروں کے کمزوروں کے بہائے جانے والے خون ناحق کے چھینٹوں سے بھیگی ہوئی ہے۔ اس میں بذکام، فلسطین، بغداد، روہنگیا، کابل اور آرمی پبلک سکول پشاور کے پس منظر میں جھلکتا ہوا کرب روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔

میرا نام بیان کر دی رہا ہے
مگر اب مرے سینکڑوں نام ہیں،
میں فلسطین کا مصطفیٰ ہوں
پشاور کا گل شیر ہوں
میں نے بذکام میں جان دی تھی
میری قبر بغداد میں ہے

....

''جھونکا'' بھی ان کی مختصر سی نظم ہے۔ اس کا مفہوم زندگی کی بے ثباتی سے عبارت ہے۔ اس کے آخری مصرعے کتنے وسیع و بلیغ ہیں۔

اندازوں کے تیر چلائے
اڑتا جائے
دائیں بائیں ٹھوکر کھائے
چلتے پنکھے سے ٹکرائے
کوڑے کرکٹ میں مل جائے

....

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں ان کی محض بارہ نظمیں ہیں۔

غزل ہماری اردو شاعری کا جوہر ہے۔ احمد حسین مجاہد نے جس طرح نظموں کی بنت اور تزئین و آرائش پر توانائیاں صرف کی ہیں، اسی طرح لیلائے غزل کے گیسو سنوارنے میں بھی بہت وقت صرف کیا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی چونتیس غزلیں ہیں۔ ان کی غزلوں کے ایک ایک شعر کا ایک مصرعہ بھی بناتے ہوئے وہ الفاظ و تراکیب کے درست استعمال کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ زبان کی تقدیس اور حرمت کا پاس ان کے ہاں بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔

آج کے بے ہنگم دور میں اردو زبان اور شاعری کے ساتھ جو کھلواڑ ہو رہا ہے اسے ہر وہ شخص بڑے رنج سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جسے اپنی قومی زبان کی عظمت اور مرتبے کا احساس ہے، وہ ایسے ستھرے اور سنجیدہ کلام کے مطالعے سے تسکین اور سرشاری حاصل کرتا ہے۔ اس جہان بے ثبات میں کوئی آرزو

ہونے کے شور میں ہائے ہو، موج کی جستجو ہو کے قطرہ کی آبرو، سارا چمکار فراق پہ جا کے ختم ہوتا ہے۔ ان کی غزل میں گل ہائے رنگ رنگ کی دیدہ زیبی بھی ہے، ہجر و فراق بھی، ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں بھی ہیں، اور عمر کی رائیگانی کا غم بھی ہے اور ناقدریِ عالم کا شکوہ بھی:

میں کیا بتاؤں گا تاخیر کا سبب اس کو
لیا نہیں ہے کہیں راستے میں دم میں نے

میں یہاں آخری مسافر ہوں
اک نظر، دیکھ لوں سرائے کو

اسی لیے تو یہ بستی ہے نامراد بہت
کسی کے کام کوئی وقت پر نہیں آیا

پہلے مجھ سے یہ تنگ اٹھکیلیاں کرتی رہی
چل پڑی پھر راہ کی دیوار میرے ساتھ ہی

ضرور آئے گا اس دشتِ تیرگی میں کوئی
سنائی دیتی ہے مجھ کو کسی چراغ کی چاپ

بھرے نہ شعر کی ندرت سے بھی جن کے قلوب
دکھاؤں ان کو میں کیا اور معجزہ کر کے

سب ختم ہو گیا مری وحشت نہیں گئی
مڑ مڑ کے دیکھنے کی یہ عادت نہیں گئی

یہ شعور رنگ و بو جس نے دیا ہے
میں وہی جانِ خزاں تھا اب نہیں ہوں

دو ہزار پانچ کے قیامت خیز زلزلے کو اب بیس سال ہونے کو آتے ہیں۔ اس زلزلے کا ذکر آئے تو اسے نہ وہ بھول سکتے ہیں اور نہ میں فراموش کر سکتا ہوں۔ اس کے المناک اور روح فرسا مناظر کی تصاویر، اس شخص کے لاشعور کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں، جو اس سے براہِ راست متاثر ہوا۔

احمد حسین مجاہد نے بھی اپنی شاعری میں زلزلے کے کئی ذکر محفوظ کر دیے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "بعد میں پڑا جنگل" کا انتساب سفیر احمد نعمانی کے نام ہے، یہ ان کے بچپن کے گہرے دوست تھے جو زلزلے میں شہید ہوئے۔ یہ مجموعہ کلام زلزلے سے کئی برس پہلے منظرِ عام پر آیا تھا۔ ان کے دوسرے مجموعے "اوک کی آگ" میں اس دوست کا ذکر موجود ہے اور اب "شہر کے کنارے سے" میں بھی انھوں نے ایک نظم "سفیر احمد نعمانی کی یاد میں" کے عنوان سے لکھی ہے، جس کے درد بھرے اشعار دل کو رنجیدہ کر دیتے ہیں:

مگر وہ تھا ہی نہیں اس لیے نہیں بولا
میں چیختا رہا مجھ کو پکار میرے یار
کسے خبر تھی کہ میرے وہاں پہنچنے تک
تو اوڑھ لے گا یہ گرد و غبار میرے یار

احمد حسین مجاہد کے فن میں اور کیا ممکنہ امکانات ہیں، یہ دیکھنا ہے۔ ان کا اگلا شعری مجموعہ کتنی مدت بعد تشکیل پاتا ہے، اس کا انتظار رہے گا۔ انھوں نے آئندہ کے متعلق اس کتاب میں اشارہ کر دیا ہے:

اچھا ہوا دن ہو کہ سلگتی ہوئی شب ہو
جو تیری مشیت ہے وہی میری طلب ہو

☆☆☆☆☆